© rasailojaraid.com

عباد اللہ فاروقی مرحوم

(قسط نمبر ۴)

اقبال کے قرآنی تصوّرات

انسانی عظمت کا قرآنی تصوّر

انسانیت پر قرآن مجید کے اور جہاں بہت سے احسانات ہیں وہاں اس کا سب سے اہم احسان یہ بھی ہے کہ اس کتاب نے انسان کو اس افسردہ کر دینے والے تصور سے آزاد کیا۔ جو عام طور پر "مذہبی شعور" کے ساتھ وابستہ تھا۔ "انسانی سرشت ہی میں بدی اور گناہ کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ لاکھ کوشش کرے اس زندگی میں وہ اپنی بنیادی بدی اور گناہ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔" اس مذہبی تصوّر نے لازمی طور پر قنوطیت اور یاسیت کے رجحانات پیدا کیئے۔ اور یہ رجحانات مذہب کے ساتھ اس طرح چمٹ گئے کہ مذہبی تصوّر اور مذہبی طرز فکر کسی نہ کسی طرح ایک یاس پسند اور قنوطی تصور کا باعث بن گیا۔ ہر چند اس تصوّر نے انسانی زندگی کے ایک تاریک دُور میں انسان کو ایک جذباتی سہارا ایک بے حس دنیا میں انسان کو غم و الم کی ناگزیری سے پیدا ہونے والا ایک روحانی اطمینان عطا کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی قوتِ عمل اور اس کا مزاحمانہ رویہ پوری طرح سے سلب ہو گیا۔ وہ اپنے کو جبر مشیت کا ایک کرشمہ سمجھنے لگا۔ زمانہ اس کے لئے فریب بن گیا اور تاریخ محض واقعات کی ایک بے معنی تکرار نظر آنے لگی۔ خدا ایک رحیم و قدیر وجود سے زیادہ ایک نامعلوم، بے نام اور بے صفات تصوّر بن گیا۔ ایسے انسان نے کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں تخیل کی اعلیٰ ترین سرحدوں سے آگے پرواز کی لیکن اس مذہبی تصوّر میں ایک ایسے انسان کے لئے گنجائش نہیں رہتی جو کائناتی قوتوں اور اپنی گزشتہ تاریخ کے خلاف مزاحمت کرتا ہے اور انسانی حیات کے دھارے کو موڑتا یا موڑنے کی کوشش کرتا ہے اور ساتھ اپنے نفس کی عمیق ترین گہرائیوں میں ڈوب کر اعلیٰ ترین حقائق کا وجدان حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس بہترین اور کامل ترین انسان اس کو قرار دیا گیا جو اس دنیا سے دور انسان کے دکھ درد سے دور بدی اور گناہ سے جسمانی طور پر پناہ مانگتا ہوا صرف مراقبہ کی زندگی گزار رہا ہو۔ اگر کبھی اس بہترین انسان کا رشتہ عام انسانوں سے جوڑنے کی کوشش بھی کی گئی تو وہ بہترین انسان ایک راہب یا تارک الدنیا کی صورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نمودار ہوتا ہے جو عام انسانوں سے محبت تو کرتا ہے لیکن اس محبت میں ہمدردی سے زیادہ رحم کارفرما ہے۔ یہ ہمہ ایسے انسان کامل کی شدید ترین مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش
زبیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست

اقبال کے نزدیک ایسا "بہترین انسان" ایک ذمہ دار وجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کی رُو سے انسان نہ صرف ذمہ دار وجود ہے بلکہ حاملِ بارِ امانت بھی ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے پیش کیا امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ بلاشبہ وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا اور نادان تھا"[1]

یہ آیہ کریمہ قرآن کی انتہائی انقلاب آفریں آیتوں میں سے ایک ہے۔ جس نے انسانی شعور کو نئے امکانات اور نئے حوصلوں سے روشناس کرایا۔ اب انسان پورے عالمِ وجود سے متصل رہتے ہوئے بھی الگ ہو جاتا ہے اور اختیار کی مملکت میں قدم رکھتا ہے۔ اطاعت محض کی معصومیت ذمہ داری کے بے پناہ امکانات اور اس سے پیدا ہونے والی حیرانی اور تردد میں بدل جاتی ہے۔ امکانی لامحدود آزادی واقعی محدود آزادی میں تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ اختیار کا استعمال لامحدود تصوری آزادی کو محدود آزادی میں بدل دیتا ہے۔ ارادہ کا یہی استعمال کہ جس امانت کو قبول کرنے سے آسمانوں اور زمینوں نے انکار کیا تھا اسے انسان نے اٹھا لیا۔ انسانی زندگی کے ممکنہ جُزء بننے کا سبب بنا۔ ایک طرف تو یہ بلند ارادہ اور حوصلہ اور دوسری طرف اس کا فانی اور زمانی مکانی حیثیت سے اس کا محدود وجود ارادوں اور تمناؤں کا مکانی دنیا سے لافانی اور ناگزیر تصادم، اور تمناؤں اور آرزوؤں کا مادے کی چٹانوں سے شکست کھا کر ٹوٹ جانا عرفان رب کا اور ایک لامحدود محیط کل قدیر اور علیم وجود کے اعتراف کا ایک نفسیاتی ماخذ ہے۔ شکستِ عزائم کے اس لمحے میں جب انسان اپنی محدودیت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے ارادے کو لامحدود ربانی ارادے کے سپرد کر دیتا ہے تو اس پر عرفانِ رب کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جب وہ اس طرح اللہ سے رشتہ جوڑ لینے کے بعد کارزارِ حیات میں واپس آتا ہے تو مراجعت کا یہ عمل ایک تخلیقی عمل بن جاتا ہے۔ اس لمحہ جب انسان اپنی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے دعا کے لئے اپنا

---

[1] إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۚ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھ بلند کرتا ہے تو وہ صرف اپنی شکست کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ایک نئی قوت اور ایک نئے حوصلے کی تلاش کرتا ہے۔ وہ دعا صرف اس لئے نہیں مانگتا کہ زیادہ مال و دولت حاصل کرے۔ بلکہ اس لئے مانگتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے وجود کو اور زیادہ مالا مال کرے۔ غالب کے الفاظ میں بہترین دعا وہ ہے جو بغیر یک دل بے مدعا مانگی جائے۔ یہ تضاد نہیں بلکہ اعلیٰ ترین روحانی تجربے کا امکان ہے۔

خدا کی مملکت صرف مسکینوں اور کمزوروں کے لئے نہیں بلکہ اس مملکت میں وہ تمام مخلوق جگہ پا سکتی ہے۔ جس نے حدود میں رہ کر دنیا کا اقرار کیا اور اپنی بنیادی عبدیت کا اقرار کرتے ہوئے اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کیا۔ قرآن مجید کی تمام دعائیں تلاش اور جستجو کرنے والوں کی دعائیں ہیں جو اپنا رشتہ رب العالمین سے جوڑتے ہیں" بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے"۔ اس لئے وہ خدا سے ہی مدد کے طلبگار ہیں۔

انسان کی آزادی اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب تمام انسان اپنے وجود کی محدودیت سے باخبر ہوں۔ خدا کی آزادی اور انسان کی آزادی میں یہی فرق ہے۔ لیکن انسان اپنی اس محدود آزادی اور محدود ارادے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کمال اور لامحدودیت کی تمنا اس کے وجود کا ایک لازمی جزو ہے۔ اقبال اس کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد　　دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے　　تپد آں زماں دلِ من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد　　بہ نگاہ ناشکیبے بہ دلِ اُمید وارے[1]

غرض دعا کے لطیف ترین لمحات میں انسان محدود سے قربت محسوس کرتا ہے اور اپنے نقص اور اپنی محدودیت کے عاجزانہ اظہار سے ایک نئی آزادی اور نیا اختیار حاصل کرتا ہے۔ اس لئے علامہ فرماتے ہیں۔

ع　مقام بندگی دیگر، نہ لوں شان خداوندی

عقل کی بے پناہ طاقتوں سے حاصل ہونیوالی خود شناسی اس وقت تکبر کا روپ اختیار کر لیتی ہے جب انسان اپنے وجود کی محدودیت اور اس سے پیدا ہونے والے نقص سے واقف نہ ہو۔ بیشتر قرآنی دعائیں اس انکساری کی تربیت کرتی ہیں جو انسانی طاقت کا انحصار نہیں ہے بلکہ جو عظیم تر ذمہ داری کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے

---

[1] پیامِ مشرق ص ۱۴۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ لوگ جو خدا کا نہ صرف اقرار کرتے ہیں بلکہ ہر دم اس لامحدود وجود کے قریب تر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بالآخر مقامِ خودی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے اعلیٰ ترین روحانی تجربہ ایک لامحدود سکون میں جذب ہو جانے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک لازوال فضیلت اور لامحدود ارادے کا ایک متحرک وجدان اور عرفان ہے جو ہمیں ایک ایسی تخلیقی قوت کے قریب تر کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لمحوں میں ایک عرفان حاصل کئے ہوئے انسان کی زبان سے یہ دعا جاری ہو جاتی ہے ”اے ہمارے رب ہمارے نور (ایمان) کو مکمل کر دے اور ہماری بخشش فرما۔ بیشک تو ہر شے پر قادر ہے“۔ قرآنی دعاؤں کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دعائیں کسی مخصوص نعمت اور کسی خاص دولت کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مزاج اور ایک خاص ذہنی کیفیت کا پیدا کرنا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت کیا ہے؟

انسان کا اپنی عبودیت کا اقرار کر کے اثباتِ خودی کرنا۔ دوسری کسی قوت کے اقتدار کا انکار پھر نتیجتاً خود اپنی فضیلت کا ادراک اپنی ذمہ داری کا احساس وغیرہ۔

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی زندگی کی اساس چار چیزوں کے اثبات پر ہے۔

(۱) کائنات (۲) خودی (۳) خدا (۴) رسالت

ان چاروں کے شعور سے انائے انسانی کی تکمیل ہوتی ہے۔ خودی سے ہم خدا کی خدائی یعنی کائنات کے علم تک پہنچتے ہیں اور اس علم سے ہی خدا کو پہچانتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۙ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۔ (۵۱/۲۰)

”یقین لانے والوں کے لئے زمین میں (خدا کی قدرت کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں میں بھی کیا تم نہیں دیکھتے“۔

کائنات اپنا وجود خود انسان کو محسوس کراتی ہے جب اس کا مقابلہ کرنے اور تسخیر کرنے کے لئے انسان کو اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی وقت میں اسے کائنات کا علم بھی ہوتا ہے اور خود اپنی ذات کی بے پناہ قوتوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ کائنات و خودی کی نشانیوں سے انسان آگے بڑھ کر اثبات ذات خداوندی تک پہنچتا ہے۔ انسان خودی رکھتا ہے اور حق تعالیٰ بھی خودی سے عبارت ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں میں ربط ہے“۔

؎ از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب   ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ فرماتے ہیں کہ انسان اگر اپنے آپ سے نامحرم نہ ہو تو حقیقتِ مطلق کو پا سکتا ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور | کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوے آدمے زن | خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست[1]

یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنی اکثر و بیشتر دعاؤں بجز خودی اور تکمیل خودی کے کسی شے کی تمنا نہیں کرتے۔ خودی کا اثبات چونکہ وجود حق کے بغیر ناممکن ہے اس لئے علامہ اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کی تلقین کرتے ہیں اور اپنی دعاؤں میں اس کا تقرب چاہتے ہیں۔ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں ؎

دل اگر بندد بہ حق پیغمبری است | ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

اسی بنا پر قرآن کریم میں ان لوگوں کے فعل کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی گئی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا لے جاتے ہیں اور اس کی ہستی کو ختم کر دیتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۔

"جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے"۔

غرض ذات باری تعالیٰ پر ایمان اثباتِ خودی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

خودی را از وجودِ حق وجودے | خودی را از نمودِ حق نمودے
نمے دانم کہ ایں تابندہ گوہر | کجا بودے اگر دریا نبودے[2]

علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام بحیثیت دین تو خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت ایک سوسائٹی یا ملت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما | از رسالت دینِ ما آئینِ ما
فرد از حق ملت از وے زندہ است | از شعاعِ مہر اُو تابندہ است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما | ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

اقبال کے نزدیک مقام خودی پانے کا واحد طریقہ یہ ہے۔

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر | بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو (جاوید نامہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کے نزدیک مقامِ خودی پانے کا واحد طریقہ یہ ہے ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر　　بحق دل بند و راہ مصطفےٰ رو

دعائیں

مذکورہ قرآنی تصورات کو ذہن میں رکھ کر اقبال نے ذاتِ باری تعالیٰ سے بے شمار دعائیں مانگی ہیں۔ ان دعاؤں کا مرکزی تصور بعینہٖ وہی ہے جو قرآنی دعاؤں کا تصور ہے۔ اقبال پر عشقِ الٰہی کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ وہ جدھر جاتے ہیں ادھر اس کی نشانی دیکھتے ہیں اور انہیں ہر راستہ خدا کی طرف ہی لے جاتا ہے۔

؎ عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو بُرد　　بر تلاشِ خود چہ مے نازد کہ رہ سوئے تو بُرد

خدا تعالیٰ سے اپنی حاجت روائی کے لئے دُعا مانگنا ایک فطری چیز ہے۔ لیکن اقبال کی عظمت اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کثرت کے ساتھ خدا کو خطاب کرنے کے انہوں نے کبھی دنیاوی جاہ و جلال کے لئے دعا نہیں مانگی۔ چنانچہ "ارمغانِ حجاز" میں وہ حضورِ حق میں ایک رباعی عرض کرتے ہیں۔

نخواہم ایں جہاں و آں جہاں را　　مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را

سجودے دہ کہ از سوز و سرورش　　بوجد آرم زمین و آسماں را

وہ صرف حمد و ثنا پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک وضعدار عاشق کی طرح شوخیاں اور ناز و نیاز بھی کرتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ نہ صرف انسان خدا کا عاشق ہے بلکہ خدا خود بھی انسان کا عاشق اور انسان کی تلاش میں ہے۔ اقبال کو یقین ہے کہ عبد و معبود، طالب و مطلوب کا رشتہ اس وقت استوار ہوتا ہے جب دل میں لگن ہو اور سینہ عشق کے نور سے منور ہو۔ عشق کی بدولت ہی انسان اثباتِ نفس کرتا ہے۔ عبادات میں بھی عشق ہی کارفرما ہوتا ہے۔ اگر عبادات میں عشق کا عنصر نہ ہو تو وہ عبادت نہیں بلکہ ایک رسمی شے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نمازِ بے حضور از من نمے آید　　ولے آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ مے پرسی

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام　　میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عبادت کے اسی فلسفے کو انہوں نے شاعرانہ انداز میں اس دُعا میں بیان کیا ہے جو مسجد قرطبہ میں لکھی گئی تھی۔

پھر شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں　　ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر　　جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ　　اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سُو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا　　حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

ذیل کے اشعار میں انہوں نے ساقی ازل کو خطاب کیا ہے۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی　　ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے　　علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات　　ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اقبال دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہیں اور ان چیزوں کے لئے بارگاہ ایزدی میں دستِ طلب نہیں دراز کرتے۔ حضور باری تعالےٰ میں بھی ان کی نظر اپنی درماندہ قوم اور اس کے آگے نوعِ انسانی پر رہتی ہے اور اس لئے وہ خود اپنی ذات میں اور اپنے کلام میں ایسی صفات طلب کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ تمام انسانوں کے کام آ سکیں۔ اس قسم کی دعائیں انہوں نے مختلف تصنیفوں کی ابتدا میں درج کی ہیں۔

پیامِ مشرق میں رباعیوں کے بعد جب افکار کا حصہ شروع ہوتا ہے تو وہ اس طرح دعا کرتے ہیں۔

اے کہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی　　ز آتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز گرمیٔ فریادِ من　　شعلۂ بیباک گرداں خاکِ سینائے مرا
چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز　　تازہ کن داغِ مرا سوزاں بصحرائے مرا

زبورِ عجم کی ابتدا اس دُعا سے کرتے ہیں۔

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ　　در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست　　یک آہ خانہ ساز مثالِ سحر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ　　جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا　　با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ
شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی!　　ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار　　تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز　　ہر ذرّہ مرا پر و بالِ شرر بدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آگے چل کر ان کی درخواست یہ ہے ۔

اے کہ زمن فزودۂ گرمی آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیم من داغِ درونِ لالہ را
خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش — آں کہ زجوئے دیگراں پر نہ کند پیالہ را

پھر کہتے ہیں ؎

بگمیرم آں چناں کن زشعلہ نوائے — دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

اقبال ایسے دل سے بیزار ہیں جو اپنے آپ سے کھویا ہوا ہو، جو دوسرے کے دماغ سے سوچتا ہو، جو کم و بیش کی فکر میں لگا ہوا ہو۔ وہ ایسا دل مانگتے ہیں جو اپنی شراب سے آپ مست ہو اور جس میں ساری دنیا سے محبت ہو۔

بدہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادۂ خویش است — بگیر ایں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی را فرا گیرد — بگیر ایں دل بگیر ایں دل کہ در بندِ کم و بیش است
مرا اے صید گیر از ترکش تقدیر بیروں کش — جگر دوزی چہ مے آید ازاں تیرے کہ در کیش است

علامہ چاہتے ہیں کہ ان کے دل میں گمان و ظن اور شک و شبہہ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور یقین سے لبریز ہو جس میں ان کو تقدیرِ عالم روشن تر نظر آسکے ؎

ایں دل کہ مرا دادی لبریز یقیں بادا — ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازیں بادا
تلخے کہ فرو ریزد گردوں بسفالِ من — در کامِ کہن رندے آنہم شکریں بادا

"انسان" کے تخیل کو انہوں نے اس قدر بلند کیا ہے اور اس کی عظمت کا احساس ان کو اس قدر ہے کہ جب وہ خدا کی راہ میں چل نکلتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ خدا کو ڈھونڈتے پھریں بلکہ وہ خود اپنی تلاش میں محو ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انسان کی ہستی اور اس کی تقدیر ان پر نمایاں ہو جائے ۔

درونِ سینۂ ما دیگرے چہ بوالعجبی است — کہ اخبر کہ توئی یا کہ ودچار خودیم
کشائے پردۂ تقدیر آدمِ خاکی — کہ ما بہ راہ گزرِ تو در انتظارِ خودیم

ان کی ایک مؤثر اور رُوح پرور مناجات وہ ہے جس سے "جاوید نامہ" کا آغاز ہوتا ہے اور جو ان کے سیر افلاک کا پیش خیمہ ہے ؎

اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت — حرفِ ادعُونی کہ گفت و با کہ گفت ؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من — جلوہ داری دریغ از جانِ من؟
از زیانِ صد شعاعِ آفتاب — کم نمی گردد متاعِ آفتاب
تو ہمی اندر شبستانم گذر — یک زماں بے نوری جانم نگر
شعلہ را پرہیز از خاشاک چیست — برق را از برفتادن باک چیست
آتشِ پیمانۂ من تیز کن — با تغافل یک نگہ آمیز کن
یا کشا ایں پردۂ اسرار را — یا بگیر ایں جانِ بے دیدار را
منزلے بخش ایں دلِ آوارہ را — بازدہ با ماہ ایں مہ پارہ را
تو فروغِ جاوداں ما چوں شرار — یک دو دم داریم و آں ہم مستعار
اینم من جاودانی کن مرا — از زمینی آسمانی کن مرا

بالِ جبریل کی تیسری نظم میں وہ خدائے تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو — یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

آخر دم تک اقبال کی یہی دعا تھی کہ انہیں تقویمِ خودی کی دولت عطا ہو۔ وہ مقامِ بندگی کو خدائی پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ بندگی میں بھی خودی کا راز مضمر ہے۔ عبادت کرنے والا اپنی الگ ہستی اور انانیت رکھتا ہے۔ اس کا اظہار علامہ نے کئی مقام پر کیا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں۔

عطا کن شورِ رومی سوزِ خسرو — عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں با بندگی در ساختم من — نگیرم گر مرا بخشی خدائی

وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہیں۔

ترا از کشمکش اندر طلب نیست — ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست
ازاں از لامکاں بگریختم من — کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

پھر کہتے ہیں کہ انسان میں سوز و ساز کی دولت ہے خدا میں نہیں ہے۔

تب و تاب فطرت ما ز نیاز مندی ما — تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نظم میں وہ خدا سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے نظارہ کے لئے اپنی خودی کھو بیٹھوں تو یہ سودا بہت مہنگا ہے میری خودی تیرے نظارہ سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ — نگیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی
نگاہِ بے ادب زد رخنہ ہا در چرخِ مینائی — دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا — شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی
مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر — ز نوری سجدہ مے خواہی ز خاکی بیش ازیں خواہی

وہ "دنیا" اور مسلمانوں کی روش سے بیزار ہو چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی حالت میں انقلاب ہو تاکہ وہ مقامِ خودی کو پا سکیں۔ فرماتے ہیں ؎

یا مسلماں را بدہ فرماں کہ جاں در کف بند — یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں یا چناں کن یا چنیں
یا برہمن را بفرما تو خداوندے تراش — یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزیں، یا چناں کن یا چنیں
یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک — یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں، یا چناں کن یا چنیں
فقر بخشی یا شکوہِ خسرو پرویز بخش — یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں یا چناں کن یا چنیں
یا بکش در سینۂ من آرزوے انقلاب — یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں یا چناں کن یا چنیں

جو دعا علامہ نے بالِ جبریل کے ساقی نامے میں کی ہے وہ ایک الہامی کیفیت رکھتی ہے۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو تیار کر

اقبال کا دل دردِ انسانیت سے معمور تھا اور چونکہ وہ نسلِ انسانی کی نجات اسلام میں دیکھتے تھے اور انسانی مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ مسلمانوں کو سمجھتے تھے۔ اس لئے لازم تھا کہ وہ اپنی قوم کی حالت پر غور کریں۔ چنانچہ متعدد مرتبہ انہوں نے بارگاہِ ایزدی اور دربارِ نبوی میں قوم کا حال بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں "مثنوی مسافر" سے وہ مناجات درج کرتے ہیں جو انہوں نے شہرِ غزنی کے ویرانے میں کہی تھی اور جس میں دنیا اور بالخصوص مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شکایت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے خداوند، اے نقشبند جان و تن   با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا بینم دریں دیرِ کہن   فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
عالم از تقدیرِ تو آمد پدید   با خدائے دیگر اُو را آخرید
ظاہرش صلح و صفا باطل ستیز   اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز
صدق و اخلاص و صفا باقی نماند   "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"
چشمِ تو بر لالہ رویانِ فرنگ   آدم از افسونِ شاں بے آب و رنگ
ایں مسلماں از پرستاراں کیست؟   در گریبانش یکے ہنگامہ نیست
سینہ اش بے سوز و جانش بیخروش   رو سرافیل است و صور اُو خموش
قلب اُو تا محکم و جانش نژند   در جہاں کالائے رُو نا ارجمند
در مصافِ زندگانی بے ثبات   دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک   آتشِ اُو کم بہا مانندِ خاک

مناجات

شعلۂ از خاکِ اُو باز آفریں   آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذب اندروں اُو را بدہ   آں جنون ذو فنون اُو را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار   صبحِ فردا از گریبانش بر آر
بحرِ احمر را بچوب او شگاف   از شکوہش لرزۂ افگن بہ قاف

وہ بارگاہِ ایزدی سے مسلمانوں کے لئے جو کچھ مانگتے ہیں وہ "بانگِ درا" کی اس مشہور دعا میں درج ہے۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے   جو قلب کو گرما دے جو رُوح کو تڑپا دے
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرّہ کو چمکا دے   پھر ذوق تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے   دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل   اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر   اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلےٰ دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر   خود داریِ ساحل دے آزادیِ دریا دے

© rasailojaraid.com